عائلی قوانین

مولانا داؤد غزنوی کے خیالات پر ایک تنقیدی نظر

(جناب نعیم صدیقی صاحب)

عائلی قانون کا مسئلہ نہ تو محض عائلی ہے نہ محض قانونی۔ بلکہ یہ معاملہ ذرا زیادہ گہرا ہے اور بڑے پیچیدہ مضمرات رکھتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا موجودہ معاشرہ اسلام کے اصولوں پر صحیح طور سے قائم نہیں رہا ہے، اس لیے ہر دوسرے شعبے کی طرح ہمارے عائلی شعبے میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ مگر انسانی دنیا کے عجائبات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بسا اوقات اصلاحات ہی کے خوبصورت عنوان سے بگاڑ پھیلائے گئے ہیں۔ بہت سے وہ عناصر جن سے دینِ حق کا خطاب یہ تھا کہ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ، انہوں نے جوابی دعویٰ یہ کیا کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ مطالبہ تھا کہ بگاڑ نہ پھیلائیے، جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کے علمبردار ہیں۔ ہمارے عائلی مُصلحین کو بھی عائلی اصلاح سے زیادہ خود اسلام کی "اصلاح" کرنے کی فکر ہے۔

نظریاتی آویزش ہمارے ہاں کے زیرِ بحث — مگر جبر سے ٹھونسے ہوئے — عائلی قوانین کو اگر ان کی سطح سے ذرا نیچے اُتر کر دیکھیے تو آپ یہاں دو مختلف نظریاتِ حیات اور دو متضاد تہذیبوں کی آویزش دیکھیں گے۔ مغربیت (WESTERNISM) جس نے خیالات و تصورات کے دائرے سے معرکہ کا آغاز کیا تھا، اب صدی بھر میں بہت سے مراحل طے کر کے مسلمانوں کے پرسنل لا کے محفوظ ترین دائرے میں خود مسلمانوں کے ہاتھوں یلغار کر رہی ہے یعنی اب مخالف تہذیب کے عساکر آخری قلعہ کی دیواریں توڑ کر عین حرمِ سرا میں گھس رہے ہیں۔

یہ جارحانہ پیش قدمی جس محاذ کی منت کش ہے اس کی ترتیب قابلِ ملاحظہ ہے۔ آگے آگے چند بیگمات دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے پیچھے پرستارانِ فرنگ کا مختصر سا طبقہ ہے۔ پھر ان کے پیچھے نئے مجتہدین ہیں جو ماڈرن اسلام کا پیکر تاویل کی چھینی اور انکارِ سنّت کے ہتھوڑے کی ضربوں سے تراش رہے ہیں۔ پھر ان سے پیچھے کمال ازم کی صہبا کے سرمست ہیں جو چاہتے تو یہ ہیں کہ ایک ہی انقلابی وہلے میں نظریۂ اسلامی کا قلادہ اُتار پھینکیں اور قوم اگر نہ مانے تو اس کے خون سے ہاتھ رنگیں، مگر خوئے غلامی نے ان میں اس سے زیادہ کوئی صلاحیت رہنے نہیں دی کہ وہ پیچھے بیٹھ کر سلسلہ جنبانی کرتے رہیں۔ پھر آخر میں بیرونی مُربیانِ کرام آتے ہیں جو اس پورے محاذ کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

یہ ماڈرن اسلام کا پہلا عملی تجربہ ہے۔ اگر اس وقت یہ بڑھا ہوا قدم جم گیا تو پھر پیش قدمی دُور تک جاری رہے گی۔ اس پہلے قدم کو روکنے کا یہی وقت ہے۔ یہ سانپ اگر نکل گیا تو پھر لکیر پیٹنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

علماء کا متحدہ محاذ قابلِ صد تعریف ہیں وہ علمائے کرام جنہوں نے عائلی اصلاحات کے اقدام کی ان گہرائیوں کو سمجھا اور ان پر اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے بروقت اطمینان بخش اور بھرپور تنقید کی۔ ہم اس بات پر بھی ان کے ممنونِ احسان ہیں کہ دو نظریوں اور تہذیبوں کے تصادُم کے ایک نازک مرحلے میں تمام کلامی اور فقہی اور گروہی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے ایک متحدہ و متفقہ آواز اٹھائی۔ مسئلہ دستور کے بعد یہ دوسری زریں مثال ہے کہ مختلف مدارسِ فکر سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام نے عالی ظرفی اور وسیع النظری سے کام لے کر ملک بھر میں ایک متحدہ محاذ کا منظر پیش کر دیا۔ یہ ان علماء کا کارنامہ ہے جن کو برسوں سے یہ طعنے دیئے جاتے رہے ہیں کہ ان میں سے دو عالم بھی کسی بات پر متفق نہیں ہو سکتے، اور دوسری طرف طعنہ دینے والے طبقوں کا حال یہ ہے کہ جب سے پاکستان بنا ہے، وہ فکری لحاظ سے انتشار کا شکار رہیں اور سیاسی لحاظ سے مسلسل دست بگریباں۔

واحد صدائے اختلاف لیکن بدقسمتی سے یہاں ایک استثناء پیدا ہو گیا ہے اور اختلاف کی کم سے کم ایک آواز بلند ہو ہی گئی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مسلم فیملی لاز آرڈیننس ۱۹۶۱ء کے سامنے آنے پر مختلف مدارسِ فکر کے چند معتمد اور نمائندہ علماء لاہور میں سر جوڑ کر بیٹھے، عائلی قوانین کا گہرا تنقیدی جائزہ لیا، ان کے متعلق غور و بحث کے بعد اشاعت کے لیے ایک تبصرہ مرتب کیا اور اس پر دستخط ثبت کیے۔ علماء کی اس مجلس میں جہاں دیوبندی، بریلوی اور شیعہ سربراہ موجود تھے وہاں اہلِ حدیث کی نمائندگی بھی قابلِ اطمینان حد تک تھی۔ متفقہ تبصرہ کے ابتدائی دستخط کنندگان میں مولانا حافظ محمد عبداللہ روپڑی، مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی اور مولانا حافظ محمود احمد روپڑی کے علاوہ مولانا عطاء اللہ حنیف صدر جمعیتِ اہلِ حدیث لاہور بھی شامل تھے؛ اور مزید قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولانا عطاء اللہ حنیف محض بطورِ خود شریک نہیں ہو گئے تھے بلکہ مولانا داؤد غزنوی صدر جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان نے بوجہِ علالت اس مجلس میں شریک ہونے کے لیے اُن کو اپنی طرف سے مامور فرمایا تھا۔ انہوں نے غور و بحث میں پوری دلچسپی لی، مسودہ کی تکمیل میں ان کا پورا پورا حصّہ شامل ہے، اور پھر انہوں نے شرحِ صدر سے اس پر دستخط ثبت فرمائے۔

اس کے بعد جب یہ متفقہ مسوّدہ توثیقِ مزید کے لیے مولانا داؤد غزنوی کی خدمت میں لے جایا گیا تو انہوں نے اسے غور و خوض کے لیے رکھ لیا۔ غور و خوض نے اتنا طول کھینچا کہ اسی دوران میں حکومت کو علماء کی مشاورت اور ان کے متفقہ تبصرہ کا پورا پورا علم ہو گیا اور لاہور کے تمام پریسوں اور اخبارات کو اس کی اشاعت سے روک دیا گیا۔ اس کے بعد تبصرہ کے دستخط کنندگان کے خلاف تفتیشی کارروائی شروع ہو گئی۔ ان کو دفتر سی۔ آئی۔ اے میں طلب کیا گیا اور حکام ــــ اور وہ بھی فوجی دور کے حکام ــــ کے گرم تیور سامنے آ گئے۔ اُس وقت پہلی مرتبہ مولانا داؤد غزنوی صاحب نے "الاعتصام" مؤرخہ ۱۷ مارچ ۱۹۶۱ء میں اختلاف کی آواز اٹھائی اور اب دوبارہ انہوں نے الاعتصام مؤرخہ ۹ اگست ۱۹۶۳ء میں اس کا اعادہ فرمایا ہے۔

قرار دادِ دعوتِ اتحاد | مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا داؤد غزنوی کے اختلافی مضمون کا مطالعہ کرنے سے پہلے دعوتِ اتحاد کی اُس قرارداد کو ذہن میں تازہ کر لیا جائے جو جمعیت اہلِ حدیث

مغربی پاکستان کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۲، ۳، ۴ نومبر ۱۹۶۲ء میں بمقام لاہور پاس ہوئی تھی اور جو صاف طور پر جمعیت کی اکثریت کے جذبات کی ترجمان ہے۔ اس قرارداد کے مخاطب "وہ تمام افراد، تمام حلقے اور تمام جماعتیں ہیں جو کتاب و سنّت کو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اساس سمجھتی ہیں اور اس ملک کی وہ فکری وحدت جس پر اس کی تشکیل ہوئی ہے، برقرار رکھنا اپنا نصب العین اور فریضہ تصوّر کرتی ہیں۔" ان جماعتوں سے اپیل کی گئی ہے کہ :-

"اپنی تمام توجہات اختلافی مسائل سے ہٹا کر اسلام کی بنیادوں کی حفاظت اور ان کے استحکام پر صرف کریں اور اس بات کا عزمِ صمیم کر لیں کہ کم از کم اس وقت تک کہ جب تک کہ اباحت پسندی اور بے دینی و الحاد کے اس طوفان کا زور ٹوٹ کر فضا معمول پر نہ آجائے، وہ اپنی توجہات فروعی اور اختلافی مسائل پر صرف کرنے کے بجائے اس حملہ کی مدافعت پر صرف کریں گے جو دین کی بنیادوں پر کیا جا رہا ہے۔"

اور ساتھ ہی یہ تنبیہ کی گئی ہے :

"... تاکہ کوئی شخص یا گروہ الحاد پسندوں کی دسیسہ کاریوں کا شکار ہو کر دانستہ یا نادانستہ ان کا آلۂ کار نہ بن جائے، کیونکہ یہی چیزیں دین کی جڑوں پر کلہاڑا چلانے والوں کے لیے سب سے زیادہ معین و مددگار ہو سکتی ہیں۔[۵]"

کاش جمعیت اہلِ حدیث کی اس قرارداد کو صدرِ جمعیت خود ہی پسِ پُشت نہ ڈال دیتے اور عائلی قوانین کے پس منظر میں اباحت پسندی اور مغربیت کا جو فتنہ چھپا ہوا ہے اسے اچھی طرح دیکھ سکتے۔ مولانا داؤد غزنوی تو بہت بڑی عالمانہ شخصیت سے آراستہ ہیں، ایک پڑھا لکھا اسلام پسند عامی بھی بخوبی اس حقیقت کو سمجھتا ہے کہ عائلی قوانین کا معاملہ محض چند قانونی دفعات اور چند فقہی جزئیات کے ادل بدل کا نہیں ہے بلکہ اس کے اندر مغرب پرستوں کا ذوقِ تحریف و تاویل روح بن کر کام کر رہا ہے اور اس روحِ بد کو منکرینِ حدیث نے بپتسمہ دے کر خالص قرآنی شان عطا کر دی ہے۔ اس کا اصل رُخ اسی "اباحت پسندی، بے دینی اور الحاد" کی جانب ہے جس کے خلاف قراردادِ[۶] تحفّظ

۵۔ الاعتصام مورخہ ۹ نومبر ۱۹۶۲ء ص ۲۔

بن متحدہ جدوجہد کی دعوت دی گئی ہے۔ مولانا غزنوی نے اگرچہ عائلی قوانین کا جائزہ من حیث الکل اپنی اختلافی گفتگو میں لیا ہی نہیں بلکہ محض اس کی دفعات کو الگ الگ کر کے دیکھا ہے، پھر بھی ایک آدھ بار ان کی توجہ ان قوانین کی فاسد فکری روح کی طرف گئی ضرور ہے اور کم از کم طلاق کی دفعات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے قلم سے یہ فقرہ ایک جگہ صادر ہو ہی گیا ہے کہ :۔

"اس دفعہ میں (یعنی دفعہ نمبر ۷) طلاق کے لیے جو دفعات تجویز کی گئی ہیں، معلوم ہوتا ہے کسی ایسے شخص یا اشخاص نے مرتب کی ہیں جو کتاب وسنّت سے بالکل ناواقف، یا دیدہ دانستہ احکامِ کتاب وسنّت کو پسِ پشت ڈال کر جدید احکام وضع کرنا چاہتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے بہت بے چین ہیں"[1]

جی ہاں، پورے عائلی قوانین کے پیچھے ایسا ہی ذہن کارفرما ہے جو کتاب وسنّت سے ناواقف بھی ہے، کتاب وسنّت کو پسِ پشت ڈال کر جدید احکام (بلکہ جدید اسلام) وضع بھی کرنا چاہتا ہے، اور جو کوئی اس کے پیچھے نہ چلے اسے سزا بھی دینا چاہتا ہے۔ اصل لڑائی اسی ٹیڑھے ذہن کے خلاف تھی، جس کی ذمہ داری کو نبھانے کے بجائے آپ نے عائلی قوانین کے اندر سے کچھ اچھے اجزا تلاش کرنے کی کاوش کو اپنے لیے پسند کر لیا۔

بہرحال عائلی قوانین کی فاسد فکری رُوح کے خلاف جب پورے پاکستان کے علماء کا متحدہ محاذ بن چکا تو آپ نے اٹھ کر اس میں اختلاف کی ایک دراڑ پیدا کر دی۔ آپ کے قلم نے اس مضمون کو لکھ کر سعیٔ اقامتِ دین کی تاریخ کے زیرِ تسوید ورق پر ایک ایسا دھبّہ ڈالا ہے جو بار بار آپ کے سامنے آئے گا اور وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتا چلا جائے گا۔ اسے دیکھ کر کسی لمحے خود آپ کو بھی سخت احساس ہوگا۔ یہ لمحہ جتنا جلد آ جائے اتنا ہی اچھا ہے، ورنہ زیادہ دیر گزرنے پر اس کی تلافی کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا۔

مولانا داؤد غزنوی کا فلسفۂ اعتدال | علماء کے متفقہ تبصرے سے اختلاف کرنے کے لیے جو موقف

[1] الاعتصام ۔ ۹ اگست ۱۹۶۳ء ستمبر ص ۹ ۔

محترم مولانا داؤد غزنوی نے اختیار کیا ہے وہ بے حد دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ اس کے لیے ایک خاص فلسفۂ اعتدال وضع کیا گیا ہے جس کا وعظ کچھ مدت سے الاعتصام کے صفحات میں نشر کیا جا رہا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

"۔۔۔۔ عائلی قوانین کی حمایت اور اس کی مخالفت میں اعتدال کی راہ اختیار نہیں کی جا رہی ہے۔ کانفرنس کی رائے میں اس کی بعض دفعات تو بے شک نصوصِ شرعیہ کے مخالف ہیں، لیکن بعض دفعات اصلاح طلب اور بعض قابلِ قبول ہیں[1]"

"جماعت اہلِ حدیث کی رائے میں یہ دونوں راہیں افراط و تفریط کی ہیں اور حدودِ اعتدال و توازن سے دور ہیں[2]"

"۔۔۔ لیکن لوگوں نے اس کی مخالفت و موافقت کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے وہ حدِّ اعتدال سے ہٹا ہوا ہے"۔۔۔ "علماء کو چاہیے کہ وہ مخالفت و موافقت میں حدِّ اعتدال سے آگے نہ بڑھا کریں[3]"

"ہمارے خیال میں اس میں افراط و تفریط کا جذبہ زیادہ کارفرما رہا ہے۔ ہر فریق نے اس کی انتہا کو اختیار کیا، یعنی یا تو اس کی انتہائی مخالفت کی یا انتہائی موافقت"۔۔۔ "ان (یعنی علماء) کے منصبِ بلند کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ بھی عوام کی طرح افراط و تفریط کا شکار ہو جائیں[4]"

کیا عجیب نقشۂ احوال ہے کہ عین اُس وقت جبکہ ایک فکری معرکہ درپیش ہو اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تمام دینی عناصر متحد ہو رہے ہوں، آپ اُٹھیں اور اعتدال کا وعظ شروع کر دیں۔ بجائے اس کے کہ اعتدال کی دعوت خود مجلسِ علماء ہی میں دی جاتی، یا کسی دوسرے موقع پر از سرِ نو مجلسِ علماء بلا لی جاتی، یہ آخر کیسا مسلکِ اعتدال ہے کہ آپ پریس اور پلیٹ فارم کے ذریعے متحدہ علماء پر تنقید فرماتے

---

[1] الاعتصام مورخہ ۹ نومبر ۶۲ء ص ۵۔ یہ عبارت اگرچہ جمعیت کی سالانہ کانفرنس کی قرارداد سے لی گئی ہے مگر جمعیت کے ذمہ دار حلقوں سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ قرارداد ضابطہ کے مطابق مجلسِ شوریٰ میں زیرِ بحث نہیں لائی گئی تھی

[2] اداریہ الاعتصام ۹ نومبر ۶۲ء [3] الاعتصام ۲ اگست ۶۳ء ص ۴ [4] الاعتصام ۹ اگست ۶۳ء اداریہ ص ۳

ہیں اور ان پر افراط و تفریط کا الزام عائد کرکے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گویا ایک آپ ہی ہیں جو راہِ اعتدال پر قائم رہ گئے ہیں۔ یہ پوزیشن ہے تو بڑی شاندار کہ آپ اسلامی اور مغربی رجحانات کی آویزش میں اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے بجائے بالکل غیر جانب دارانہ شان سے مقامِ اعراف پر کھڑے ہوں اور دونوں فریقوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہوئے اپنے فلسفۂ اعتدال کے ترازو میں تول رہے ہوں۔ مگر یہ بھی تو سوچیے کہ اس پوزیشن کو اختیار کرنے کے خوفناک فوری اثرات کیا ہیں؟ ــــ یہ کہ بے دینی، الحاد اور اباحت پسندی کے علمبرداروں کو متحدہ علماء کے خلاف خود علماء ہی میں سے ایک گواہ اپنے حق میں مل جاتے جو ان کے خلاف افراط و تفریط کا چارج شیٹ لگا رہا ہو۔ ہم ہرگز یہ سوءِ ظن نہیں کرسکتے کہ مولانا غزنوی دیدہ و دانستہ غلط عناصر کے ہاتھ مضبوط کرنے پر کبھی تیار ہوسکتے ہیں مگر نادانستہ سہی، امرِ واقعہ تو اب یہی ہو گیا ہے ــــ اور ایسے دینی حلقے کی طرف سے ہو گیا ہے جو دوسروں کو متنبہ کر رہا تھا کہ "کوئی شخص یا گروہ الحاد پسندوں کی دسیسہ کاریوں کا شکار ہو کر دانستہ یا نادانستہ ان کا آلۂ کار نہ بن جاتے۔"

اِس فلسفۂ اعتدال کے نتائج | بدقسمتی سے محترم مولانا داؤد غزنوی اور ادارۂ الاعتصام نے فلسفۂ اعتدال کی جو راہ اختیار کی ہے وہ انہیں کہیں کا کہیں لے گئی ہے۔ شروع میں بات اس مقام سے چلی تھی کہ عائلی قوانین میں بعض باتیں اچھی ہیں، بعض قابلِ ترمیم و اصلاح ہیں اور بعض ناقابلِ قبول ہیں مگر سمجھوتے کا یہ اندازِ نظر بالآخران کو جہاں لے آیا وہ یہ مقام ہے کہ:

> "...... اس اتنے بڑے پلندے میں آخر کوئی چیز تو صحیح ہوگی"۔ "اس کا آخر کوئی پہلو تو صحیح اور لائقِ التفات ہوگا"[1]

یہ چند الفاظ ایسے ہیں کہ ان میں اس کمزور طرزِ فکر کی پوری پوری پرچھائیں سامنے آگئی ہے جو فلسفۂ اعتدال کے پیچھے کام کر رہا تھا۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ کونسا نظریہ، نظام، دستور، یا قانون ہے جس میں باطل اور شر کے ساتھ سرے سے حق اور خیر کا کوئی جز نہ پایا جاتا ہو۔ بڑے سے

[1] الاعتصام ۔ ۹ اگست ۱۹۶۳ء ۔ اداریہ: "علمائے کرام کی خدمت میں" ص ۳۔

بڑا کفر بھی کچھ نہ کچھ اجزائے حق اپنے ساتھ لیے کر ان کے سہارے قائم ہوتا ہے سرمایہ داری اور اشتراکیت ہو یا قادیانیت و پرویزیت، ان کے پلندوں میں بھی کوئی نہ کوئی اچھی بات ضرور نکل آئے گی۔ پھر کیا ان سب کے ساتھ بھی وہی "اعتدال" کا معاملہ کیا جائے گا جو عائلی قوانین کے بارے میں تجویز کیا جا رہا ہے

قابلِ گرفت ترجمان | فی نفسہٖ اختلاف قابلِ گرفت چیز نہیں ہے، البتہ جب اختلاف غلط موقع پر اور غلط طریق سے کیا جائے تو وہ قابلِ گرفت ہو جاتا ہے۔ محترم مولانا داؤد غزنوی، ادارۂ الاعتصام اور ان کے ہم خیال حضرات نے ایسے موقع پر اور ایسے طریق سے اختلاف کیا ہے کہ ہر ذی شعور مسلمان کے لیے اس کا نوٹس لینا ضروری ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں حسبِ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:-

(۱) اختلاف کرنے کا واحد محل متفقہ تبصرہ مرتب کرنے والی مجلسِ علماء کے اندر تھا، جس میں مولانا داؤد غزنوی بہ نفسِ نفیس اگر شریک نہ تھے تو کم سے کم ان کے مامور کردہ یا ان کے اذن یافتہ نمائندہ مولانا عطاء اللہ حنیف موجود تھے۔ اس مجلس میں جو تبصرہ مرتب کیا گیا تھا اس سے اگر مولانا کو اختلاف تھا تو وہ مطالبہ کر سکتے تھے کہ مجلس کا اجلاس پھر بلا لیا جائے جس میں وہ بھی شریک ہوں۔ اس مجلس کے باہر اختلافی آواز اٹھانا کیسے مناسب تھا؟

(۲) اس تبصرے پر دستخط کرنے والے بعض دوسرے علماء بھی کچھ نہ کچھ اختلاف رکھتے تھے، مگر انہوں نے علماء کے اتفاق کو نقصان پہنچائے بغیر اس پر اپنے اختلافی نوٹ ثبت کر دئے اور بعد میں آج تک کوئی اختلافی آواز نہ اٹھائی۔ مثلاً مولانا حافظ محمد عبداللہ روپڑی نے اس نوٹ کے ساتھ دستخط کیے:

> "مضمونِ بالا کی بعض جزئیات اگرچہ تفصیل طلب یا غور طلب ہیں، مگر اصل مقصد کے لحاظ سے میں اس پورے مضمون سے متفق ہوں۔"

اسی طرح مولانا حافظ کفایت حسین صاحب مجتہد (ادارۂ عالیہ تحفظِ حقوقِ شیعہ پاکستان) نے حسبِ ذیل نوٹ کے ساتھ دستخط ثبت کیے:- (۱)

۱؎ پمفلٹ: "مسلم فیملی لاز آرڈیننس پر پاکستان کے علماء کا تبصرہ" مرتبہ میاں طفیل محمد بی اے ایل ایل بی صفحہ ۳۶

"مجھے اصل دفعات سے وہی اختلاف ہے جو اس مضمون میں ظاہر کیا گیا ہے لیکن ان دفعات کی وضاحت میں جو امور تحریر فرمائے گئے ہیں، ان کے بعض اجزا سے اتفاق نہیں ہے[1]"

مولانا حافظ کفایت حسین کا فقہی نقطۂ نظر جمہور علماء اہلِ سنّت سے بہت زیادہ مختلف ہے، بمقابلہ اُس اختلاف کے جو عام اہلِ سنّت اور اہلِ حدیث کے درمیان ہو سکتا ہے۔ مگر حافظ صاحب نے عظیم تر مصلحتِ دینی کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے اختلاف کو درکنار رکھ کر علماء کی متحدہ آواز کا ساتھ دیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر محترم مولانا داؤد غزنوی ہی کے لیے کونسا ایسا محرکِ شدید تھا جو اس میں آڑے آیا کہ وہ دستخط کرنے میں لیت ولعل دکھائیں اور پھر اپنے اختلافی نقطۂ نظر کو ضرور سامنے لاکر ہی رہیں؟

(۳) پھر اگر انہیں اپنی اختلافی رائے لانا ہی ضرور تھا تو کیا یہ کافی نہ تھا کہ کسی شکل میں وہ ایک بار سامنے آجاتے اور اتمامِ حجّت ہو جاتے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک ہی بات پہلے ۱۷ ارمارچ ۶۱ء کے الاعتصام میں سامنے لائی جاتی ہے، پھر نومبر ۶۲ء کی اہل حدیث کانفرنس میں اسے ایک قرارداد کی شکل میں دُہرایا جاتا ہے، پھر الاعتصام پے در پے اس پر مضامین لکھتا ہے اور آخر کار محترم مولانا داؤد غزنوی پورا ایک مضمون تحریر فرماتے ہیں۔ اس کے لیے اتنا تکرار واصرار کیوں ہے؟

(۴) پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مولانا داؤد غزنوی کا فلسفۂ اعتدال پر مبنی اختلافی مضمون عین اس زمانے میں نشر ہوتا ہے جبکہ عائلی قوانین کی تنسیخ کے لیے ملک بھر کے عوام متحدہ آواز بلند کر رہے ہوتے ہیں، جبکہ صوبائی ایوان میں تنسیخ کی قرارداد پاس ہو چکی ہے اور جبکہ قومی اسمبلی میں وہ معرضِ بحث میں ہوتی ہے۔ کیا یہ عین ایسے وقت میں کمند توڑنے کی کوشش نہیں ہے — خواہ نادانستہ ہو — جبکہ مسئلہ لبِ بام سے دو چار ہاتھ رہ گیا ہو؟

(۵) اس سلسلے میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ نومبر ۶۲ء کی اہل حدیث کانفرنس میں عائلی قوانین

[1] پمفلٹ "علمائے کرام کا تبصرہ" مرتبہ میاں طفیل محمد صاحب بی۔ اے ایل ایل بی ص ۳۶

پر غور کرنے کے لیے گیارہ افراد پر مشتمل جو بورڈ بنایا گیا تھا اس نے ان قوانین پر اپنا کوئی تبصرہ مرتب کیا ہے یا نہیں؟ اگر کیا ہے تو اسے کیوں شائع نہ کیا گیا؟ اور اگر نہیں کیا ہے تو بورڈ کو نظر انداز کر کے خود صدر جمعیت بالا بالا اپنی انفرادی رائے کی نشر و اشاعت کیسے فرما رہے ہیں؟

اب ہم محترم مولانا داؤد غزنوی کے اصل مضمون کا جائزہ لیتے ہیں جو متحدہ علماء کے تبصرے کے مقابل میں شائع کیا گیا ہے۔

لغزشِ نظر یہ مضمون صاحبِ مضمون کی جس سب سے بڑی لغزشِ نظر کو سامنے لاتا ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے، یعنی مولانا نے عائلی قوانین کی وضاحت کو جزو بہ جزو تو دیکھا اور وہ اس کے بڑے اجزاء میں سے بہ صد کاوش اچھے اجزاء کی تلاش فرماتے رہے مگر انہوں نے کُل کو بیک نظر نہ دیکھا۔ انہیں پہلے یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ ان قوانین کی مجموعی ہیئت کیا ہے؟ یہ معاشرہ کو کس رُخ کی طرف لے جانے والا امزاج رکھتے ہیں؟ ہمارے ملک کے کونسے عناصر نے یہ طرزِ فکر اُبھارا ہے؟ یتیم پوتے کی بحث کہاں سے چلی؟ تعدّدِ ازدواج کے بارے میں ہنگامہ کا آغاز کس طرح ہوا؟ طلاق کا انوکھا ضابطہ کہاں سے آیا؟ کن حالات میں پہلا کمیشن مقرر کیا گیا تھا؟ اس کمیشن میں افراد کس قسم کے لیے گئے تھے؟ پھر ان قوانین کو کس غیر جمہوری طریق سے اکثریت پر جبر کر کے ٹھونسا گیا ہے؟ ان تمام امور کو نظر انداز کر کے انہوں نے قانون کی دفعات کو صرف اس لحاظ سے دیکھنا شروع کر دیا کہ اس میں کون سے اجزاء درست اور کونسے غلط ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم ایک عمارت کو صرف اس لحاظ سے دیکھیں کہ اس میں اینٹیں، کڑیاں، ستون، دروازے اور کھڑکیاں کہاں کہاں ٹھیک اور کہاں غلط ہیں۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ عمارت مجموعی طور پر کس نوعیت کی ہے اور کس مقصد سے کس نقشے پر بنائی گئی ہے۔ وہ عدالت ہے؟ سکول ہے؟ دفتر ہے؟ مندر ہے؟ میخانہ ہے؟ اصطبل ہے؟ ہوٹل ہے؟ یا مسجد ہے؟ ظاہر ہے اس کا فیصلہ مجموعی ہیئت ہی سے ہوگا۔ عمارت اگر قبلہ رُخ نہیں ہے اور مسجد کی خصوصیات و ضروریات سے خالی ہے تو اس کے کچھ اجزاء کے درست اور کچھ کے نادرست ہونے کی بحث چھیڑنا لاحاصل ہے۔ ایک اصطبل کی دو چار کڑیاں اور ستون بدل کر آپ کوئی اچھی مسجد نہیں بنا سکتے

یہی وجہ ہے کہ ملک کے علماء نے متفق ہو کر اس آرڈی ننس کو منسوخ کرنے اور اہلِ علم کے مشورے سے عائلی مسائل کے متعلق ایک نیا ضابطہ مرتب کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ مولانا داؤد غزنوی اگر اس نگاہ سے پورے معاملہ کو دیکھتے تو وہ کبھی علماء کے اس متفق علیہ موقف سے اختلاف نہ کرتے۔

تعدّدِ ازدواج پر ناجائز پابندی محترم مولانا داؤد غزنوی کا مضمون شرعی اور فقہی نقطۂ نظر سے بعض ایسے خطرناک مضمرات اپنے اندر رکھتا ہے جو اس ملک میں شریعت کو مسخ کرنے کا دروازہ کھول سکتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ تعدّدِ ازدواج پر آرڈی ننس کی عائد کردہ پابندیوں کے حق میں جو استدلال انہوں نے کیا ہے اس سے تو کسی طرح صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

تمام اہلِ سنّت، محدثین و فقہا خواہ سلف کے ہوں یا حال کے، اس کو جزوِ ایمان بھی سمجھتے ہیں اور قانونی اصول بھی کہ نصِ قرآنی سے جو احکام ثابت ہوں ان میں ردّ و بدل کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اب دیکھیے کہ سورۂ نساء میں تعدّدِ ازدواج کا حکم جہاں بیان ہوا ہے کیا وہاں اس طرح کی کوئی پابندی لگائی گئی ہے کہ ایسا قدم اٹھانے سے پہلے ایک شخص کو کسی ادارے کے سامنے پیشگی یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ عدل کر سکتا ہے یا نہیں؟ "اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا" کے مخاطبین ٹھیک وہی ہیں جنہیں "فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ" کہا گیا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا نکاحِ ثانی کا اقدام کرنے والے کے ذمّے ہے کہ وہ بیویوں میں عدل کر سکے گا یا نہیں۔ اس معاملے میں قرآن کی نص کو سامنے رکھ کر اصلاحِ احوال کے لیے قانون سازی کی زیادہ سے زیادہ گنجائش اتنی ہے کہ اگر کوئی شخص تعدّدِ ازدواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کے بعد عدل نہیں کرتا تو اس صورت میں حکومت مداخلت کرے گی۔ اس بنا پر کہ اس نے شریعت کی دی ہوئی ایک اجازت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور ایک صاحبِ حق کو اس کے حق سے محروم کیا۔ اگر اس جرم کا ارتکاب کثرت سے کیا جانے لگا ہو تو حکومت اس کے لیے تعزیر بھی مقرر کر سکتی ہے، مگر قرآن کی حدود کے باہر جا کر من گھڑت قانون سازی نہیں کر سکتی۔

قرآنی نص کے حدود سے تجاوز کر کے قانون سازی کرنے کی راہ کھولنے کے لیے مولانا داؤد صاحب جو دلیل لاتے ہیں وہ یہ ہے:

"اس سے ملتا جلتا مسئلہ ہے کہ کتابیہ کے ساتھ نکاح جائز ہے اور قرآن کریم میں یہ نصِ صریح اجازت موجود ہے۔ اب اگر حکومت کا سربراہ یا امیرِ مملکت یہ محسوس کرے کہ عیسائی عورت سے نکاح از روئے قرآن کریم جائز تو ہے لیکن ہمارے ملک کے حالات ایسے ہیں کہ اس جواز پر عمل کرنے سے بہت سے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں تو امیرِ مملکت کو حق حاصل ہے کہ عیسائی عورتوں سے نکاح پر پابندی عائد کر دے، جیسا کہ فاروقِ اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی فوجوں کو جب شام میں داخل ہوئیں اور انہوں نے عیسائی لڑکیوں سے شادیاں رچانی شروع کر دیں، حکم فرمایا کہ کوئی شخص عیسائی لڑکی سے شادی نہ کرے، اور جنہوں نے شادی کر لی ہے وہ طلاق دے دیں۔ اس فوج میں صحابہ بھی تھے اور تابعین بھی۔ کسی نے یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ قرآن کریم کی صریح اجازت کے بعد آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ منع کریں[1]۔ . . ."

ان سطروں کو پڑھ کر دلی صدمہ ہوا کہ ایک مشہور دینی حلقے کی جانب سے اب اس طرح کے طرزِ استدلال کا نمونہ ہمارے سامنے آ رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہم اہلِ حدیث علماء کو حسبِ ذیل نکات کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ جس معاملہ کو بنائے استدلال بنایا گیا ہے، اس میں بہ حیثیت روایت کے سخت اضطراب پایا جاتا ہے۔ اور مختلف روایات میں وہ سخت لفظی اختلافات کے ساتھ منقول ہوا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ اگر اس سے استدلال کرتے بھی ہیں تو یہ دیکھنا ہوگا کہ فی نفسہٖ یہ روایت کیا معنی اور حیثیت رکھتی ہے؟ کیا حضرت عمرؓ نے کوئی عمومی فرمانِ امتناعِ نکاحِ کتابیات کے سلسلے میں جاری کیا تھا جس نے حلال کو حرام کر دیا ہو؟ کیا وہ حکم تھا یا مشورہ؟ حکم تھا تو کیا وہ فوج یا انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے بعض افراد کے لیے خاص تھا، یا عام شہریوں کے لیے جاری کیا گیا تھا؟ پھر وہ ایک خاص علاقے کی خاص حالات رکھنے والی کتابیات کے متعلق تھا یا اصولی و عمومی پابندی کا حامل تھا؟

---

[1] الاعتصام "مسلم فیملی لاز آرڈیننس ۱۹۶۱ء پر ایک نظر" ۹ اگست سنہ ۶۳ء صفحہ ۸

دورانِ تحریر راقم نے روح المعانی جزء سادس، ابن کثیر جزء ثانی، تفسیر الطبری جلد ۹، احکام القرآن ابن عربی جزء ۲، اور احکام القرآن جصاص ج ۲ میں متعلقہ مبحث کے سلسلے میں جملہ روایات و تاویلات کو چھانا مگر حضرت عمرؓ کا ایسا کوئی فرمانِ عمومی نہ مل سکا۔ واقعہ صرف ایک حضرت حذیفہؓ کا ہے جسے جصاص نے یوں لیا ہے:

"تزوج حذيفة بيهودية، فكتب اليه عمرؓ ان خل سبيلها، فكتب اليه حذيفة: احرام هي؟ فكتب اليه عمرؓ: لا، ولكني اخاف ان تواقعوا المؤمسات منهن" (قال ابو عبيد: يعني العواهر)[1]

اس انفرادی ہدایت کو مشورہ پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے لیکن اسے اگر حکم مانا بھی جائے تو یہ بالکل محدود اور خاص ہے۔ محدود اور خاص اس لحاظ سے بھی کہ اس کا خطاب فوج اور انتظامیہ کے ایک فرد یا زائد افراد سے ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی حکومت اپنی فوج اور انتظامیہ پر ایسی مختلف پابندیاں لگا سکتی ہے جو عام شہریوں پر نہیں ہوتیں، یہ محدود اور خاص اس لحاظ سے بھی ہے کہ اس کا مقصود صرف "مؤمسات" یا "عواہر" یعنی بدچلن عورتوں سے بچانا ہے۔ لفظ "مِنْهُنّ" کا استعمال مشورہ یا حکم کو بلحاظ مدعا اور بھی اختصاص دے دیتا ہے۔ قابلِ غور یہ بات ہے کہ حضرت عمرؓ اس کی تصریح فرماتے ہیں کہ نکاح کتابیات حرام نہیں ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا کتب تفسیر و احکام میں حضرت عمرؓ کے مندرجہ بالا قول کے باوجود نکاح کتابیات کو جائز و مباح قرار دیا گیا ہے اور اس اباحت سے صحابہؓ نے عملاً فائدہ اٹھایا ہے۔ حضرت عثمان بن عفانؓ نے نائلہ بنت فرافصہ کلبیہ (نصرانیہ) سے نکاح کیا۔ طلحہ بن عبید اللہؓ نے شامی یہودیہ سے نکاح کیا۔ حذیفہ بن الیمان، کعب بن مالک، مغیرہ بن شعبہ نے کتابیات سے نکاح کیے یا ان کو نکاح کے پیغام بھیجے۔ بلکہ حافظ

---

[1] احکام القرآن للجصاص۔ جزء ۲۔ باب تزویج الکتابیات۔ ترجمہ: حضرت حذیفہ نے ایک یہودیہ سے نکاح کیا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ اس کو چھوڑ دیں۔ حضرت حذیفہؓ نے جواب میں لکھا کیا یہ حرام ہے؟ حضرت عمرؓ نے لکھا، نہیں، مگر مجھے اندیشہ ہے کہ تم لوگ ان کی بدچلن عورتوں میں نہ پھنس جاؤ۔

ابن کثیر تو کہتے ہیں:

"فنکح الناس نساء اھل الکتاب، وقد تزوج جماعة من الصحابة من نساء النصاریٰ ولم یروا بذالك بأساً"[1]

جو پہلو حضرت عمرؓ کے سامنے تھا وہ تو تمام مفسرین، محدثین اور فقہاء کے بھی پیش نظر رہا ہے اور ان سب کے ہاں عفت کی شرط پر بحث پائی جاتی ہے بعض بزرگان سلف نے نکاح کتابیات کو امکانی خرابیوں کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ کراہت کے درجے میں رکھا ہے۔ کسی نے بھی یہ تسلیم نہیں کیا کہ حضرت عمرؓ کے کسی حکم یا فرمان نے مکمل قدغن لگادی تھی، یا کبھی کوئی عام حکم امتناعی جاری کر دیا تھا، اور نہ کسی نے حضرت عمرؓ کے لیے ایسے اختیارات کو تسلیم کیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر آپ حضرت عمرؓ کے لیے اس معاملے میں یہ حق اور اختیار تسلیم کرتے ہیں تو پھر تطلیقات ثلاثہ کے معاملہ میں کیوں حضرت عمرؓ کے باضابطہ دیئے ہوئے فیصلہ اور جاری کردہ حکم کو بھی قبول نہیں کر لیتے؟

چوتھی گذارش یہ ہے کہ اتنا بڑا اختیار کہ حالات وضروریات کے تحت نص کے حدود سے تجاوز کر کے بھی قانون سازی کی جاسکتی ہے، ہماری نگاہ میں شارع کے علاوہ کسی بھی شخص یا ادارے کو نہیں دیا جا سکتا۔ مگر مولانا غزنوی کے مضمون کی مندرجہ عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس اختیار سے دور حاضر کے مسلمان ملکوں کے ہر سربراہ اور امیر مملکت کو پوری فراخدلی سے مسلح کر دینا چاہتے ہیں، اور گویا ساتھ ہی اذن عام دیتے ہیں کہ ع

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

اس پہلو سے یہ عبارت ٹھیک اسی انداز پر آگئی ہے جو طلوع اسلام کے اوراق پر جلوہ گر ہوتا رہتا ہے۔ کیا مولانا نے یہ سوچا کہ دور حاضر میں اسلامی ممالک کے "امیر المومنین" اسلام کے ساتھ کیا کیا

[1] ابن کثیر ج ۲۔ تفسیر المائدہ، آیت ۵۔ ترجمہ: "چنانچہ لوگوں نے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کیے اور صحابہ میں سے ایک جماعت نے نصاریٰ کی عورتوں سے شادیاں کیں اور اس میں انہوں نے کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔

"اجتہادی کارروائیاں" کرنا چاہتے ہیں؟ اس آڑ میں تحریفِ دین کا سلسلہ ایک بار چل پڑا تو پھر کہیں وہ رُکے گا؟ اور پھر غیر اسلامی ریاستیں جہاں مسلمان آباد ہیں (مثلاً بھارت) وہاں کے حکمران مسلمان حکومتوں کی نظیر سامنے رکھ کر مسلمانوں کے پرسنل لا کے بخیے نہ ادھیڑ دیں گے؟ بھارت میں تو یہ صورتِ حال پیدا ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ ایک بار یہ دروازہ کھلا تو پھر کہیں بچاؤ نہ ہو سکے گا۔

پانچویں گزارش یہ ہے کہ اگر حکومتِ وقت کو آپ معاشرے کے بگاڑ کی وجہ سے یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ نصوص سے آگے جا کر قانون سازی کرے تو پھر اگر حکومت اسی بگڑے ہوئے معاشرہ کے حالات کو سامنے رکھ کر طلاق کی تحریری اطلاع چیئرمین کو دینا لازم کرتی ہے یا یتیم پوتے کی حق رسانی کی ایک راہ نکالتی ہے تو اس پر آپ کو کیوں اعتراض ہے؟

چھٹی گذارش یہ ہے کہ جس اصول کی بنا پر آپ حکومت کے لیے یہ پابندی لگانا درست سمجھتے ہیں کہ نکاحِ ثانی کے لیے ایک شخص عدل کی پیشگی یقین دہانی کرے، اسی اصول کے تحت (حالاتِ معاشرہ کی بنا پر) پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کرنے کی قید کو کیوں صحیح تسلیم نہیں فرماتے؟

ان سوالات کی روشنی میں شاید آپ کی توجہ ان تضادات کی طرف جاسکے جو مضمون زیرِ بحث نے پیدا کر دیے ہیں۔ اپنے ڈھب کا محض ایک نکتہ عائلی قوانین میں پا کر اس سارے پلندہ کو چند جزوی ترامیم کے ساتھ قبول کرنے کے لیے تیار ہو جانا مولانا کی عالمانہ بصیرت سے فروتر ہے۔ غالباً یہی وہ جزء ہے جس کے متعلق مولانا بار بار فرماتے رہے ہیں کہ اس میں کوئی نہ کوئی جزء تو اچھا بھی ہوگا۔ حالانکہ تطلیقاتِ ثلاثہ کے متعلق جو صورت عائلی قوانین میں طے کی گئی ہے وہ بھی خود اہلِ حدیث کے مسلک کے مطابق نہیں ہے۔ بلکہ اگلا سوال یہ بھی ہے کہ اگر یتیم پوتے کی وراثت کے معاملے میں منکرینِ حدیث کا مسلک ملک بھر میں بالجبر نافذ کر دیا جاتے (اور اس وقت ایسا ہی ہے)، تو اس پر بھی اعتراض کا کیا موقع رہ جاتا ہے؟ جس کا زور یا جس کا داؤں چل جاتے وہ اپنی سی کر گزرے۔ مگر ایسے غیر صحت مندانہ جبری طریقوں سے جب کبھی اعتقادی یا فقہی مسلک ٹھونسے جاتے ہیں تو ان کے خلاف خوفناک ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔

درد مندانہ گذارش | ان معروضات کے ساتھ راقم کی دردمندانہ گذارش یہ ہے کہ اکابر علمائے

اہلِ حدیث ایک بار سر جوڑ کر بیٹھیں اور محترم مولانا داؤد غزنوی کے ذاتی مضمون کو در کنار رکھ کر جماعتی لحاظ سے عائلی قوانین کے متعلق ازسرِنو رائے قائم کریں۔ نیز وہ ایسا نقطۂ نظر اختیار کریں کہ علماء کے متحدہ محاذ سے الگ کیمپ لگانے کی جو صورت اب پیدا ہو گئی ہے یہ ختم ہو جائے۔

ماہنامہ چراغِ راہ کراچی کی نئی پیش کش

تحریکِ اسلامی نمبر

ماہنامہ چراغِ راہ کراچی اپنی سابقہ روایات کے مطابق اکتوبر ۱۹۶۳ء میں منعقد ہونے والے کل پاکستان اجتماع جماعت اسلامی کے موقع پر شائع کر رہا ہے۔

حصہ اوّل : مضامین کی ایک مختصر جھلک

- فریضہ اقامت دین - مجدد الف ثانی اور ان کی تحریک - تحریک اسلامی اور شاہ ولی اللہ

حصہ دوم : جماعت اسلامی کا موجودہ مرحلہ - اسلامی انقلاب کیلئے جماعت اسلامی کی جدوجہد —

- جماعت اسلامی اور جمہوریت - جماعت اسلامی اور خارجہ پالیسی - جماعت اسلامی اور خدمت خلق —
- جماعت اسلامی کا معاشی پروگرام - جماعت اسلامی کے اجتماعات - جماعت اسلامی کا تربیتی پروگرام۔
- جماعت اسلامی عالمی لٹریچر میں - تحریک اسلامی مشرقی پاکستان میں۔

حصہ سوم : میری تحریکی زندگی کا ایک اہم واقعہ (مختلف تاثرات)

حصہ چہارم : مذاکرہ : تحریک اسلامی کا مستقبل

حصہ پنجم : داعی کے خطوط

آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت اور خوبصورت سرورق

ضخامت ۳۰۰ صفحات۔ قیمت ۴ روپے

عام اشاعت فی پرچہ ۶۲ پیسے سالانہ چندہ مع خاص نمبر ۹ روپے

ناظم ادارہ ماہنامہ چراغِ راہ، دو وزیر مینشن نکل روڈ کراچی

(ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ: ...... محمد منظور الحسن ۶۸/۸۸ پریم نگر۔ کانپور۔ یو۔ پی۔)